.... اُنسان کے نام

”جس کے بُودار، سڑے سانسوں میں دُم لیتا ہے“

فہرس

پیش لفظ

پھر وہی پیش لفظ! —— لیکن خیر!

'زہرخند' کا پیش لفظ بھی میں خود ہی لکھ رہا ہوں اس لئے نہیں کہ مجھے کو مفر یا یعنی "مقدمہ نگار" نہیں ملتے بلکہ اس لئے اور محض اس لئے کہ میں پامردئی ہمسایہ سے بہشت میں نہیں جانا چاہتا —— مجھے اپنے کسی ہم عصر کی سخن فہمی سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی ضرورت نہیں ہے میں اپنے قارئین کو اتنا بدذوق نہیں سمجھتا کہ وہ کسی رہنما کے اشارے یا سہارے کے بغیر چل ہی نہیں سکتے میرے لئے یہی بہت ہے کہ میں گذشتہ چار ساڑھے چار سال کی نظموں کا انتخاب پیش کر رہا ہوں۔ اور آپ! —— آپ تو مجھے جانتے ہی ہیں —— کم از کم 'زہرخند' کے شاعر کو جانتے ہیں اس لئے کہ اس مجموعے کی بیشتر نظمیں رسائل میں شائع ہو کر آپ تک پہنچتی رہی ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ آپ نے انہیں بے حد سراہا ہے نہیں تو میں اس مجموعے کو آپ تک پہنچانے کی جرأت ہی کیوں کرتا —— میں فطرتاً جھجک طلب واقع ہوا ہوں لیکن بقولِ غالب ؎

دوست کا کھاؤں فریب!

ہاں! آپ جو جی چاہے اپنی طرف سے خود لکھ کر مقدمے کے طور پر اس کے ساتھ چسپاں کر لیجئے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن کتاب کے آغاز میں کسی "ڈاکٹر جانسن" کا یہ ارشاد کہ "میں یوسف ظفر کو جدید تر شعراء کا امام سمجھتا ہوں" —— اور "میں فلاں نظم کو بہترین قرار دیتا ہوں" میرے لئے

ناقابلِ برداشت ہے۔

کہتے ہیں کہ اپنی کسی تصنیف کا ذکر کرنا اس لئے بُرا ہے کہ اُس سے خود پسندی ٹپکتی ہے اور بعض حضرات اسے پروپیگنڈا سمجھتے ہیں۔ میں ان باتوں کا قائل نہیں ــــ تو سُنئے ــــ "زہرخند" میرا پہلا مجموعہ کلام ہے ــــ "زنداں" نہیں ــــ اشاعت کے اعتبار سے اوّلیت کا حق "زنداں" ہی کو پہنچتا ہے، لیکن اس کے باوجود میں "زہرخند" ہی کو اپنا پہلا مجموعہ سمجھتا ہوں ــــ وجہ؟

"زہرخند" کی نظموں کا انتخاب سب سے پہلے ۱۹۴۳ء میں ہوا ــــ اسکے بعد ــــ کوتاہیاں اور مجبوریاں، کچھ میری اور کچھ میرے ناشران کی یہاں تک کہ ۱۹۴۴ء آ پہنچا۔ نظموں کو دوبارہ ترتیب دیا گیا اور ــــ یہ مجموعہ آپکے سامنے ہے۔ تاخیر تو بہرکیف ہوتی ہی لیکن اس سے ایک فائدہ ہوا۔ یہ مجموعہ سنہ ۱۹۴۰ء سے مارچ سنہ ۱۹۴۴ء تک کی نظموں کا یہ انتخاب ــــ میری شاعری کی ارتقائی منازل کا غمّاز ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ زمانہ میری شاعری اور دنیا کی کشمکش کے اعتبار سے نہایت اہم ہے۔

"زنداں" ایک خاص دور کی پیداوار ہے۔ اُس کا یوسف ظفر ایک منفرد تصوّر کا چراغ لئے ایک خاص منزل کی طرف گامزن ہے۔ یہاں ایک دیوانہ ہے ۔ نہیں ۔ کہیں ایک بچّہ ہے کہ غبارے بنا بنا کر ہنستا ہے اور اُن کے پھوٹنے پر بلک بلک کر روتا ہے۔ کہیں ایک مفکّر ہے کہ اپنے پھیلائے ہوئے افکار کے جال میں اُلجھا پڑا ہے اور سِنّ و سال کی قیود تک برداشت نہیں کرسکتا۔ کہیں ایک پیرِ فرتوت ہے کہ چبا چبا کر باتیں کئے جا رہا ہے۔ باتیں کارآمد و بےکار ۔ کہیں ایک وطن پرست اور کہیں ایک بین الاقوامی سیّاس ــــ لیکن بہرصورت ایک بات یکساں ہے اور وہ ہے ــــ زہرخند!

سنہ ۱۹۴۰ء اور سنہ ۱۹۴۱ء کے یوسف ظفر میں خند زیادہ ہے اور زہر کم۔ وہ تلخی کو تلخی تو سمجھتا ہے

لیکن اُسے اس لئے گوارا کر لیتا ہے کہ ع

"مسکرا سکتا ہوں، جی سکتا ہوں، گا سکتا ہوں"

اس کے بعد یہ تلخی بڑھتی چلی جاتی ہے — اُمیدیں بر آتی ہیں لیکن مایوسی کم نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ زہر اُس کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے، آغاز میں وہ ہر اچھوتے ماحول کو اپنے موجودہ ماحول پر ترجیح دیتا ہے لیکن ہر اچھوتا پن چھوٹی موٹی بنتا چلا جاتا ہے — کائنات سمٹ کر ایک آنسو بن جاتی ہے۔ خند — اب بھی ہے کہیں کہیں ممکن ہے آگے چل کر یہ بھی نہ رہے — قرائن سے تو یہی نظر آتا ہے

اس مجموعے کی ترتیب میں ایک خاص بات کا خیال رکھا گیا ہے۔ یعنی اس کی کوئی ترتیب نہ ہو۔ گذشتہ چار پانچ سال میں میری شاعرانہ نظر نے کئی پہلو بدلے اور مناسب تو یہی تھا کہ اس نظر کی تخلیقات کو اسی مطابقت سے پیش کیا جاتا۔ لیکن اہلِ نظر جانتے ہیں کہ بے ترتیبی اور بدنظمی بھی خوش سلیقگی سے کم حسین نہیں — وہ شخص جو اپنے نظامِ زندگی کو مرتب کرنے سے بھی محروم کر دیا گیا ہو اپنے بس کی کسی بات میں ترتیب کہاں قبول کر سکتا ہے — 'زہر خند' — مجھے تو ان منتشر اجزاء کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرے سامنے ایک ہجوم ہے جس میں قہقہوں کے ساتھ ماتم کی صدائیں بھی بلند ہو رہی ہیں — مسکراہٹیں آنسوؤں میں لتھڑی ہوئی ہیں، مسرتیں چیخوں سے ہم کنار ہیں۔ کسی کو کسی کا غم نہیں، ہر کوئی اپنی سی کہے جا رہا ہے۔ میں نے زندگی میں یہی کچھ پایا ہے، اور زندگی کے اس آئینے میں اسی کا عکس پیش کر رہا ہوں۔ اس میں تجسس کا ایک پہلو بھی ہے۔ ایک لطیف پہلو — ان نظموں کو رنگوں کی یگانگت کے اعتبار سے خود مرتب کیجئے، ممکن ہے آپ کو اس ترتیب کے پردے میں ایک زندہ عکس حرکت کرتا ہوا نظر آئے — گام بگام بڑھتا ہوا۔ گام بگام جھلّاتا ہوا۔

اس مجموعے کی ایک خوبی یا خرابی یہ ہے کہ میں نے اس میں اسلوبِ بیان اور اسلوبِ خیال کے تجربوں کو یکجا کر دیا ہے ــــ ان تجربوں کی رفتار رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی جا رہی ہے ــــ شاید میرا تخیّل پختہ ہو چلا ہے ــ شاید میں اپنے لئے ایک شاہراہ معیّن کر چکا ہوں ــــ آج کی نظموں کو دیکھتے ہوئے تو میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں ــ ممکن یہ بھی ہے کہ کل زندگی کوئی ایسی کروٹ لے جس سے میں کسی نئے اُفق کی تلاش میں نکل پڑوں ــــ بہر حال اس مجموعے کو اس نظر سے دیکھنے کی بھی ضرورت ہے۔

جی چاہتا ہے ایک افسانہ لکھوں ــــ ایک نہایت دلچسپ افسانہ جس میں اپنی مختلف کیفیّات کا اظہار کروں ــــ اپنی زندگی اور شاعری کی باہمی یک رنگی پر تبصرہ کروں، تاکہ وہ حضرات جو میرے اسلوب سے مجھ پر ترقی پسندی کا لیبل لگاتے ہیں سمجھ لیں کہ میں کسی مقصدی ادب کا قائل نہیں، میرے سامنے میری زندگی، میرا ماحول، میرا وطن، میری شاعری، بے بسی ہے اور بس ــ ترقی پسندی میں کوئی بُرائی نہیں ــــ ہر شخص ترقی پسند ہے لیکن اس کے ساتھ جن لوازمات کو وابستہ کر دیا گیا ہے اس سے جو مراد لی جاتی ہے میں اُسے قبول نہیں کر سکتا۔ میں تنزّل پسند یا دوسرے لفظوں میں رجعت پسند نہیں ــــ اس کا ثبوت ــــ "زہر خند" ــ "زنداں" ــــ میری ہر نظم۔

اب تو شاید افسانے کی ضرورت نہیں رہی۔

اور ہاں ــــ اور کیا ؟ ــ یہی، شکریہ۔

یوسف ظفر

لاہور، ۱۵ر جولائی ۱۹۴۴ء

پیشکش

جاؤ اے میرے تخیّل کے حسیں پروانو
جاؤ، جل بجھنے کو ہے شمعِ حیاتِ انساں
جاؤ، تم جاؤ کہ رونے کو نہیں ہے کوئی
اُنہیں لاشوں پہ جہاں ہنسنے کو شام آتی ہے
دُور محرابِ اُفق پر کہیں سستاتے ہیں
ہانپتے سائے سسکتے ہوئے بےکس راہی
جنہیں رہبر کی، نہ منزل کی نہ مقصد کی خبر

جاؤ، تم جاؤ وہاں کھیتوں کے اُس پار کہیں
گرم راہوں کے اُدھر، سرد لگاہوں کے اُدھر
اور اُن جلتے ہوئے خشک لبوں پہ ناچو
مرے گیتو، مرے نغمو، مرے رعنا نغمو

(۲)

میں نے راتوں کو ستاروں کے چرا کر موتی
تمہیں بہلایا ہے، پہنایا ہے حوروں کا لباس ــــ
میں نے ہر موڑ پہ، ہر راہ پہ، ہر منزل پہ
تمہیں سینے سے لگایا ہے، تمہیں چاہا ہے
میں تمہارے لئے ہاں ایک تمہارے ہی لئے
وقت اور موت کی تلواروں پہ چلتا ہی رہا
مرے گیتو، مرے نغمو ــــ مرے رعنا نغمو

(۳)

جاؤ اب وقت ہے۔ پھر وقت نہیں آسکتا
جاؤ ــــ سنگینوں کو، توپوں کو نگوں سر کر دو

جاؤ۔۔۔ اُن ماؤں کے سینوں میں چراغاں کر دو
جن کے دِل سونے ہیں، گھر سُونے ہیں، آنکھیں سُونی
جاؤ اُن بہنوں کی تسکین کا ساماں بن جاؤ
جن کی نظریں ہیں کہیں دُور، بہت دُور کہیں
کِسی جنگاہ، کسی راہ، کِسی مرقد پہ

جاؤ اُن کلیوں کے ہونٹوں میں تبسم بھر دو
جنہیں معلوم نہیں۔ کچھ بھی تو معلوم نہیں
کیسے مرتے ہیں، کہاں مرتے ہیں، کیوں مرتے ہیں
وہ جنہیں جانتے، مگر روتے ہوئے دیکھا تھا

جاؤ اے میرے تخیّل کے حسیں پروانو
میرے اشکوں کی، مری آہوں کی پروا نہ کرو
اے مرے گیتو، مرے گیتو۔ جہاں کے گیتو
جاؤ اب وقت ہے، اب وقت ہے، اب وقت ہے، جاؤ

نذر

تیرا ممنونِ محبت ہی نہیں ہوں اے دوست!
تیرا احسان ہے یہ بھی کہ زباں رکھتا ہوں
اک اچھوتا سا تصور ہے مری آنکھوں میں
ایک مخصوص سا اندازِ بیاں رکھتا ہوں
لاکھ مایوسِ تمنا ہوں، مگر پہلو میں
دل کو آزادِ غمِ سود و زیاں رکھتا ہوں
یہ بھی ہے تیری عنایت، کہ جہاں میں رہ کر
ساری دنیا سے جدا اپنا جہاں رکھتا ہوں

میرے لفظوں میں رواں ہے ترے نغموں کا لہو
جس کو اپنی کہوں، وہ بات کہاں رکھتا ہوں

(۲)

سوچتا ہوں کہ کسی دن مرے نغموں کی صدا
روح کے آئنہ خانے میں اُتر آئے گی
تیری تحریکِ نظر اور مرے اشعار کی ضو
وقت کے رُخ پہ درخشندہ نظر آئے گی
چاند کی مشعلیں گُل ہوں گی سنبھالے لے کر
دھول تاروں کی اُڑے گی تو خبر آئے گی
حادثے بڑھ کے مٹا دیں گے فریبِ دُوری
رات آئے گی پہ بے زادِ سفر آئے گی

سوچتا ہوں، اِسی عالم میں، اسی صورت میں
تُو مرے سامنے اے جانِ ظفرؔ آئے گی

(۳)

آئے گی تو، تجھے معلوم ہے پھر کیا ہو گا
تجھ کو میں تیری نگاہوں سے چھپا رکھوں گا

خامشی ہو گی زباں میری ملاقات کے وقت
دل کو قربت کی شعاعوں سے بچا رکھوں گا

کھلتے کھلتے تری نظروں کی حیا سے بچ کر
جو بھی آئے گا مرے لب پہ روا رکھوں گا

دل تو موہوم سی اک شے ہے نہ جانے کیا ہو
پیشکش کے لئے کچھ اس سے سوا رکھوں گا

زندگی آئے گی پہنانے مجھے تاجِ بقا
میں ترے قدموں میں یہ تاجِ بقا رکھوں گا

انتہا

یہ جھرّیاں مرے چہرے کی تیرے بستر کی
چراغِ طاقِ ندامت، فراق کی قندیل
عیارِ شومئ قسمت، شکستگی کی دلیل
مرے نصیب کی تحریر، نقشِ محرومی

خموش ہوں شبِ فرقت ہے، دل دھڑکتا ہے
ہزار نغمے لپکتے ہیں میرے کانوں میں
ہزار قہقہے لپٹے ہوئے فضاؤں میں
مجھے ابھارنے آئے ہیں، مجھ کو سکتہ ہے......

شعروشاعری

طبعِ موزوں کے لئے کم تو نہیں ہیں یہ سوال
کیسے اشعار کہوں اُن کی زمیں کیسی ہو
کون سی بحر ہے موزوں مرے نغموں کے لئے
کیسے الفاظ خیالات کے مظہر ہوں گے؟
سوچتا ہوں کہ گراں تو نہیں گزرے گی یہ بحر
فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلن،
بیشتر جس میں تخیّل مرا ڈھل جاتا ہے
چاہتا ہوں کہ بیاں میں ہو لطافت ایسی
کہ اُسے پڑھتے ہی اک کیف سا محسوس کریں

وہ غزلخواں جنہیں اندازِ کہن بھاتا ہے
رقص کرتے ہوئے الفاظ ہوں جنکے گھیرے
ذہن میں حلقے بناتے ہوئے پرواز کریں
میری تخئیل میں جادو کا اثر ہو پیدا
میرے انداز میں جھکے ہوئے نغمے ہوں نہاں
جو سماعت میں اُترتے ہی قیامت ڈھائیں،
چاہتا ہوں کہ تصوّر میں تخیّل کی جھلک
ایک دنیا نئی تخلیق کرے دنیا میں ——

ان خیالات کی الجھن میں گرفتار ہوں میں
میری خواہش ہے کہ جو ہو مرا گرویدہ ہو
اور جیسے بھی ہو بن شاعرِ فن کار رہوں

(۲)

سوچنا یوں تو بھلا ہے مگر ایسی کیا سوچ
جس سے بیدار نہ ہو جوہرِ ذاتی اپنا
ہیچ ہے غیر مقفّیٰ و مقفّیٰ کا خیال

مجھ کو کیا اس سے کہ شعروں میں مرا ذوقِ نظر
ہے وہی جو مجھے ممتاز کرے دنیا میں
کیا مجھے اپنے خیالوں کے ادا کرنے کو
اُسی رفتار سے چلنا ہے کہ جس سے اب تک
دھیرے دھیرے مرے ہم عصر چلے جاتے ہیں؟
کیا مجھے شہرت و عزت کے لئے جینا ہے؟
داخلِ فرض ترنّم بھی ہے شاعر کے لئے؟
گرد آلودہ جبیں اور گریباں صد چاک
شاعری کے لئے کیا یہ بھی ضروری ہوگا؟
اپنے اشعار کو لوگوں کی نظر سے دیکھوں
یہ نہیں ہوگا۔ نہیں ہوگا — نہیں ہو سکتا
میں مداری تو نہیں ہوں کہ پٹاری لے کر
کھیل دکھلاتا پھروں شعبدہ بازوں کی طرح
میں تو خود اپنا پیمبر ہوں کہ میرے نغمے

میرے احساس کی تصویر ہوا کرتے ہیں،
میرے شعلے تو مری روح کی آوازیں ہیں،
کتنی کم ظرفیٔ فطرت ہے مری سوچ کہ میں
اپنے اشعار کو لوگوں کی نظر سے دیکھوں،
فاعلاتن، فعلاتن سے غرض کیا مجھ کو
قافیہ کیا، مری تخئیل کو کوئی طاقت
پابجولاں نہیں کر سکتی غلاموں کی طرح

(۱۴)

کون کہتا ہے کہ اشعار ہیں میرے الفاظ
یہ تو اک خام خیالی ہے جہاں والوں کی
میں تو جو سنتا ہوں نظروں سے تری کہتا ہوں
یہ الگ بات ہے مفعول فعولن فعلن
یا فعولن فعلاتن میں بیاں ہو جائے

حیاتِ رائگاں

زندگی کے بیکراں مرگھٹ میں دیکھا!
میری راتوں کی کتنی لاشوں کے ڈھیر
راکھ بن کر اُڑ رہے ہیں ہر طرف
تیرگی میں کانپتے شعلے کئی
چونک اُٹھتے ہیں نگاہوں میں مری —
میری راتیں — جس طرح زخمی کی چیخ،
مدّتوں بے کارواں پھرتی رہے
اور آخر ایک دن کہسار سے

ایسی ٹکرائے کہ اس کی تلخ گونج
پتھروں سے آگ برسانے لگے

میری راتیں ــــ بے سراغ و بے چراغ
اپنے سایوں ہی میں کھو کر رہ گئیں

(۲)

لوٹ آئیں کاش وہ راتیں مری
وقت پھر لائے انہیں تیرے لئے
آج دہرائے انہیں تیرے لئے

آسماں پر چاند ہے تارے بھی ہیں
کوئی لوٹا دے مجھے راتیں مری

(۳)

جستجو راتوں کی مجھ کو تو نہیں
میری تکمیلِ تمنّا ہو چکی
اب مجھے کیا ــــ آنے والی زندگی

جس میں آسودہ ہیں راتوں کے ہجوم
گھٹ کے بن جاتے دمِ آخر تو کیا؟

(۴۰)

یوں نہیں اے غمگیں نہ ہو میرے لئے
میری راتیں تھیں تری راتیں نہیں
میں بھلا دوں گا انہیں — تیرے لئے ——

طوفان

مطمئن کون ہو اس ساحلِ نومیدی پر
اس کی آغوش میں محفوظ رہا بھی ہے کوئی
گردنیں ڈھلکی ہوئی دیکھ سیہ سایوں کی
ان کے ہونٹوں سے کبھی گیت سنا بھی ہے کوئی

چاندنی رات عبارت ہے سکوں سے لیکن
سینۂ بحر پہ طغیانیِ سیماب ہے کیا
کہیں چاندی کی چٹانیں کہیں لوہے کے غار
گھٹتا بڑھتا ہوا یہ سلسلۂ آب ہے کیا

ابھی دن پھوٹ کے سہلائے گا ان موجوں کو
ابھی ساحل پہ حبابوں کا نیا طلسم ہوگا
لاکھوں انسان — سفید اور سیہ لاکھوں حباب!
لاکھ رقصندہ حبابوں میں سکوں گم ہوگا

موجۂ بحر نے تھک ہار کے لی انگڑائی
وہ گجر بجنے لگے، بلبلے کچھ پھوٹے ہیں
وہ دھڑکنے لگے ساحل کے کنارے شاید
موجیں ٹکرائی ہیں یا تارے کہیں ٹوٹے ہیں

(۳)

سطح ساحل پہ ابھرنے لگے رقصندہ حباب
رل گئے اک موج بھی جو بن نہ سکے، بہہ نہ سکے
تند جھونکوں کی بھلا تاب کہاں سے لائے
وہ کہ جو اپنے ہی قدموں پہ کھڑے رہ نہ سکے

مرطفن کون ہے یہ ساحلِ نومیدی ہے
یہ حوادث کے خطر، آتی ہوئی موت کا غم

دیکھ! آغوشِ تلاطم میں سکوں پا گئی موج
اُٹھ کہ آغوشِ تلاطم میں سکوں پائیں ہم
موج ٹکرائے تو ہر سمت چراغاں ہو جائے
ورنہ ساحل ہی کو اندازۂ طوفاں ہو جائے

سفر ۱

بھیگتی رات کی بے نور سیہ تاریکی——
راستے پہ کئی سنسان، سبک سر سائے
میری آہٹ پہ اچک کر مجھے یوں دیکھتے ہیں
جس طرح گھات میں دشمن کوئی گھبرا جائے

آسماں اطلس و کمخواب کا سیلِ رخشاں
کہکشاں لاکھ ستاروں کی گزرگاہِ جمیل
کارواں رقص کناں بڑھتے ہیں شب بھر جس پہ
جس طرح رقص کرے بزمِ طرب کی قندیل

اور یہ بہتی ہوئی راہ — مری راہِ حیات
بنی آدم کے یہ پتھرائے ہوئے خواب تمام
یہ فلک بوس مکاں — جیسے کسی مجرم کے
تختۂ دار پہ جکڑے ہوئے اعصاب تمام

پھر ستاروں کی طرف آنکھیں اُٹھی جاتی ہیں
پھر اِسی راہ کی خاموشی کو میں دیکھتا ہوں
اُس طرف قافلے ہیں، رقص ہے، موسیقی ہے
اِس طرف ایک ہی احساس کہ میں تنہا ہوں

میری خواہش ہے کہ دن ناچتے ناگن کو جواب
اور اِن اونچے مکانوں سے نکل کر آئیں
میری دنیا کے تراشے ہوئے رنگیں شعلے
رقص کرتی ہوئی گاتی ہوئی دوشیزائیں

اور اِس راہ کی یہ جھلسی ہوئی خاموشی
سیکڑوں نغموں کے سیلاب میں بہتی جائے

لیکن افسوس کہ یہ بھی نہیں میرے بس میں
کیسے ممکن ہو کہ پانی میں ڈبو دوں سائے
شب کا یہ رنگِ سیہ چھوٹ سکے گا، کہ نہیں؟
سحرِ خاموشی کبھی ٹوٹ سکے گا، کہ نہیں؟

بہار

کیا ہوا — کون سی اُمّید یہاں بر آئی؟
کون آزاد ہوا قیدِ زباں بندی سے؟
کس کے سینے کی خلش دُور ہوئی پھُول کھلے؟
کون دل شاد ہوا؟ — کس کی خزاں بیت گئی؟
کس کی مشکل ہوئی آساں کہ بہار آئی ہے؟

پھُول شاخوں پہ غزل خواں ہیں ہواؤں کی مہک
گو بجنتے نغمے سناتی ہے مری نظروں کو
سائے اُٹھے ہیں نہائے ہوئے تاریکی میں

آسماں رنگ میں ڈوبا ہوا افسانہ ہے —
کیا ہوا؟ — کوئی بتاؤ — کہ مری نظروں میں
اسی فردوس کے افلاس کی تصویریں ہیں
انہیں غنچوں میں کئی بھوکوں کے بیکس لاشے
سسکیاں لیتے ہوئے مجھ کو نظر آتے ہیں

مجھ پہ کھلتا نہیں اس عیدِ بہاراں کا سبب
مجھ پہ آئینہ نہیں جشنِ طرب کا باعث
میں تو اتنا ہی سمجھتا ہوں کہ اس گلشن میں
سالہا سال کی مجبور غلامی کا لہو
پھوٹ کر پھول تو بنتا ہے مگر آگ نہیں —

تحلیل

چاندنی میں گھاس پہ لیٹا ہوں میں
پاس کے چُپ چاپ رستے کی طرح
لیکن اُس کے سینۂ ہموار کو
کوئی راہی اب مسلتا ہی نہیں
راستہ ہے ایک بستر کی طرح
جس پہ کوئی صبح تک سویا نہ ہو

اَور میرے پاینتی سے نرم گھاس
اک شکن آلود چادر بن گئی
اَور جھینگر کی مسلسل تیز تان
گوندھ کر لائی ہے جس کو خامشی
دُور سے میرے وہاں گوش تک
ٹمٹماتی ہے ستاروں کی طرح

دُور ہے خاموش، میلا، سرد چاند
ٹمٹماتے ہیں ستارے جس کے پاس
سہمے مُرغی کے چوزوں کی طرح —
دُور ہے پُرہول سایوں کی قطار
جس میں گم ہیں سیکڑوں کوّوں کے پر —
دُور سے آتی ہے جھینگر کی صدا
دُور ہے مجھ سے خیالوں کا جنوں
دُور ہوں خود سے نہایت دُور ہوں —

آج اس نظّارۂ خاموش میں
مَیں نہیں ہوں — میں نہیں ہوں ہوش میں
آج میں نے اپنے کانوں سے سُنی
تیرے اُن مے گوں لبوں کی گفتگو
آج وہ آواز وہ رنگیں صدا
چوڑیوں کی چھن چھناچھن کی طرح
تیر کر میرے لہو میں سو گئی
تیر کر میری رگوں میں کھو گئی

کھو گئی ہے — کھوئی نہیں، سوئی نہیں
گونجتی ہے اب بھی کانوں میں مرے
وہ صدا — شیریں صدا، رنگیں صدا
چوڑیوں کی چھن چھناچھن کی طرح
گونجتی ہے اب بھی کانوں میں مرے —

دُور سے آتی ہے جھینگر کی صدا
لیکن اُس سے دُور کوسوں دُور ہوں

دُور ہوں اس وقت اپنے آپ سے
میں تو ہوں اس وقت اِس منظر سے دُور
ایک وادی میں جہاں تیری صدا
گھل کے بن جاتی ہے اک جادو کی جھیل ——

رنگ

ایک ہی ساز کے سب نغمے ہیں یہ رنگ تمام
ہاں یہ ہے بات کوئی گہرا کوئی ہلکا ہے
آنکھ پڑ جاتے نزی اس پہ تو موتی بن جائے
یوں تو آنسو ہے جو آنکھوں سے مری چھلکا ہے

رینگتی پھرتی ہیں سایوں میں سنہری کرنیں
سائے کالے ہیں لچکتے ہیں سرک جاتے ہیں
سرسراتی ہوئی پتوں میں ہوا چلتی ہے
اور اک رنگ سے سو رنگ چھلک جاتے ہیں

دُور، سنسان خموشی میں ہے سڑک پہ تنہا
ایک انساں کے قدم چلنے میں رُک جاتے ہیں
لاکھ آوازیں لپک اُٹھتی ہیں شعلہ بن کر
بیسیوں راگ قدم لینے کو جھک جاتے ہیں

تیرا جلوہ ہے کہ دھوکا ہے مری آنکھوں کا
ایک ہی رنگ میں سو رنگ لیے بیٹھا ہوں
نُور و ظلمت بھی نظر آتے ہیں یک رنگ مجھے
سامنے تُو ہے کہ آنکھوں کو سیے بیٹھا ہوں

آخری سہارا

چراغ ہی سے اگرچہ چراغ جلتا ہے
مگر نہ مہر سے چشمِ خرد ہوئی روشن
نہ اِن ستاروں سے کوئی سُراغ ملتا ہے
چراغِ طُور، چراغِ قمر، چراغِ بہار
ہر ایک سمت چراغاں، ہر اک طرف انوار
یہ شاہراہ، مگر پھر بھی تیرہ رُوز رہی
یہ زندگی کے مسائل سُلجھ سکے نہ کبھی

سکوت — لاکھ صداؤں کا گونجتا مدفن
صدا — ہزار خموشی کا اک ہجومِ شکست
بہار — لاکھ خزاؤں کے خوں کا فوّارہ
خزاں — ہزار بہاروں کی حسرتِ بے دست
یہ پیچ، اِن کے سوا اور بھی کئی عُقدے
نہ فکر ہی، نہ تحیّر ہی کھول سکتا ہے
نگاہِ گرمِ تجسّس کا قول — سکتہ ہے

مگر شکست سے بدتر ہے اعترافِ شکست
میں خوش ہوں خوش ہوں کہ ناکامیوں سے کام نہیں
مری نگاہ کو اِن خامیوں سے کام نہیں
مرے لئے ہے ابھی تک پیامِ راحت و عیش
تری نگاہ میں، تیری گداز باہوں میں
جو راز پھولوں کی پیغمبری سے مل نہ سکا
وہ راز مجھ کو ملا ہے تری نگاہوں میں

اگر حیات کے رازوں کو پا نہیں سکتا
تو تیرے چہرے کے پھولوں میں جھول سکتا ہوں
یہ کم نہیں ہے سکونِ دلِ حزیں کے لئے
کہ تیرے حُسن کے جھولوں میں جھول سکتا ہوں

سائے

چاندنی رقص کیا کرتی ہے جن پیڑوں پر
اُن کے پتّوں کے تلے سہمے ہوئے سایوں کو
موت کے کانپتے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کا لمس
خوف سے پیرہن چاک پنہا دیتا ہے
سیم کا نرم، سکوں فام، سمندر جیسے
ایک ہی موج سے لہرا کے چھلک جاتا ہے
ایک ہی جھونکے سے یہ سہمے ہوئے سائے بھی
کسی وحشی کا گریبانِ دریدہ بن کر
نور کے سینے پہ بسمل کی طرح لوٹتے ہیں

گنگناتی ہے شگوفوں کے دو تاروں پہ ہوا
چاندنی رقص میں، دم توڑتے ٹھنڈے سائے
کون اِن کالے پتنگوں کا بھلا غم کھائے

(۲)

چاند کی کرنیں، فرنگی کی یہ دوشیزائیں
اپنی گدرائی ہوئی باہوں پہ اتراتی ہیں
اپنی زلفوں کو حسیں شانوں پہ لہراتی ہیں
بھوک کے زنگی کے سیہ بچے۔ فلاکت کے نقوش
کانپتے سائے، بلکتے ہوئے، جھلاتے ہوئے
ایک ہی جھونکے سے آپس میں لپٹ جاتے ہیں
اور اپنوں ہی کی تلواروں سے کٹ جاتے ہیں

(۳)

بھوک اُگتی ہے مزاروں کی سیہ مٹی سے
خون آلودہ سیہ ماضی کی بے حس لاشیں

بھوک کے سایوں کو جنم دیتی ہیں — مُردہ مائیں
کوکھ سے زندہ یتیموں کو اُگل دیتی ہیں
چاند کی کرنیں — فرنگی کی یہ دوشیزائیں
رقص میں محو مسلتی ہوئی اِن سایوں کو
گنگناتی ہیں نئے گیتوں، نئی تانوں کو

(۱۳)

مفلسی سینۂ تاریک سے پیدا ہو کر
رات بن جائے گی، افلاک پہ چھا جائے گی
چاند کی کرنیں — لپٹے ہوئے سائے کی ردا
اپنی ہی تانوں کے تانے میں اُلجھ کر، بے حس
وقت کی ہونکتی ظلمت میں اُتر جائیں گی
بھوک کے زنگی کے سیہ بچے یہ ننگے سائے
اِنہیں کرنوں کا لہو چوس کے لہرائیں گے
اور یہ چم کی طرح دہر پہ چھا جائیں گے

طمانچہ

تمتماتے ہوئے رخسارے پہ
اک طمانچے سے لہو دوڑ گیا
ڈبڈبا آئے تری آنکھوں میں اشک
بات بھی کانپتے ہونٹوں پہ رکی
مجرمانہ ترا اندازِ نظر
حسرت آلود نگاہیں تیری
گڑ گئیں اپنے ہی قدموں کے قریب
خشمگیں اور غضبناک حریف
اپنی سی ہانکے چلا جاتا تھا

پاس کے لوگوں کو تُو نے دیکھا
اور شرما کے جھکالیں نظریں
ہاتھ تُو نے بھی اٹھایا لیکن
اپنے ہی گال کے سہلانے کو
تُو اُسے کچھ بھی نہ کہہ سکتا تھا
تیری نظروں میں جہاں تھا تاریک
جو نہ مانا تھا وہ اب مان گیا

(۳)

یہی ہوتا ہے یونہی ہوتا ہے
زندگی کے رُخِ آسودہ پر
حادثات ایک طمانچہ ہی تو ہیں
پاس کا ایک طمانچہ کھا کر
آرزو خاک میں مل جاتی ہے
موجِ طوفاں کی، طمانچہ بن کر

کشتیٔ عمرِ رواں کھیتی ہے
جب کوئی پھوٹ کے رو دیتا ہے
اُس کے گالوں پہ نظر آتی ہیں
انگلیاں — پانچ طمانچے کا نشاں —

زندگی اِن سے نہیں بچ سکتی —

مجھ کو آتے ہیں نظر ہر جانب
ہاتھ — اُٹھتے ہوئے تقدیر کے ہاتھ
اور آتی ہے طمانچوں کی صدا
گورے گالوں سے سیہ گالوں سے —

قیدی

کوئی زنجیرِ گراں قید نہیں کر سکتی
سنگ و آہن کی بنائی ہوئی کوئی دیوار
تجھ کو آغوش میں تا دیر نہیں رکھ سکتی

تیری فریاد ہے زنجیرِ گراں کی فریاد
تیری دیوار میں پتھر کی نہیں سنگینی
تیرے دروازے میں لوہے کی سلاخیں ہیں کہاں

ایک آسودۂ اوہام، طلسمِ جامد
تجھ کو پابند کئے دیتا ہے، تو قید نہیں
تو ہے آزاد — کہ آزادِ شب و روز ہے تو

(۲)

یوں تو پابند ہیں ہر حال میں اہلِ بینش
آدمی کے لئے کیا قیدِ عناصر کم ہے
ایک ہی گردشِ ایّام کے سب قیدی ہیں
سانس بھی حلقۂ زنجیر سے کچھ کم تو نہیں
زندگی دیدۂ بینا کو ہے اک حبسِ دوام
تو نے زنجیرِ تخیّل کی سنی ہے جھنکار
تیری زنجیر کی آواز سے کچھ کم تو نہیں!

تیری تنہائی شب و روز کا پیمانہ ہے

آنکھیں سِل سکتی ہیں، لب بند بھی ہو سکتے ہیں
پر تجھے کوئی گرفتار نہیں کر سکتا
تو ہے آزاد — کہ آزادِ شب و روز ہے تو

(۴)

مسکراجیل کی دیواروں میں رہنے والے!

تو ہے آزاد ــــ ذرا سوچ کہ آزاد ہے تو

تیری دیوار تو پتھر کی ہے ــ بے حس دیوار

جو مرے سامنے اک سایۂ بے معنی ہے

لیکن افکار کی دیوار ہے میری دیوار

جس کو میرے ہی تخیّل نے بنایا ہے مگر

کوئی طاقت اسے مسمار نہیں کر سکتی ــــ

مُلاقاتیں

ایک آرام کی خاطر میں نے
کس قدر جھیلے ہیں آلام، نہ پوچھ
ایک راحت کے تصوّر کی کشش
شب کے اُجڑے ہوئے ویرانوں میں
مجھ کو ہمراہ لئے جاتی رہی
اور میں چلتا رہا، چلتا رہا

بے کفن مُردے مری راہوں میں
سوچ میں ڈوبے پڑے رہتے تھے
لالہ و گُل کے مفسّر ہوں گے
اُن کے ڈھانچے! مرے اللہ توبہ
گوشت اور پوست سے بے قبہٗ مگر
چہرے کے خول میں آنکھوں کی بجائے
ایک پُر ہول چراغِ ظلمت
سرد رنگوں کی طرح جلتا تھا

راستے خوف سے تھرائے ہوئے
میرے قدموں کے تلے چیختے تھے

مرزا غالب کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

تیز شعلے مری آوازوں کے
گنبدِ چرخ سے ٹکراتے تھے
اور بہہ جاتے تھے پانی کی طرح
میں، مگر چلتا چلا جاتا رہا
شب کے اُجڑے ہوئے ویرانوں میں
ایک راحت کے تصوّر کی کشش
مجھ کو ہمراہ لئے جاتی رہی ——

(۲)

میری راہوں میں اِنہیں راہوں میں
سائے آتے رہے جاتے بھی رہے
جگمگاتے ہوئے انجُم سر پہ
مسکراتے رہے اگاتے بھی رہے ——

تنہائی

ڈرتا ہوں کہ آواز نہ سُن لے جلے کہیں
یہ میری نگاہوں کا دُبارہ سُن سکے
اِس مہکی ہوئی رات کی بے خوابی میں ——

تغیّر

گھٹا کو دیکھ کے یوں میرا دل دُکھا تھا کبھی
جو میرا حال ہُوا ہے بنا ہُوا تھا کبھی

وہ اشک اب مری آنکھوں میں جھلملاتے ہیں
جنہیں چراغِ سرِ طُور جانتا تھا کبھی

وہ نغمے آج ہیں بارش کے سرمگیں جھالے
جنہیں تبسمِ گُل رنگ سے سنا تھا کبھی

وہ راتیں دن کی طرح رنگ و بُو سے عاری ہیں
کہ جن میں تجھ سے مرا سامنا ہُوا تھا کبھی

وہ جھریاں مرے چہرے پہ ہیں بھنور کی طرح
جنہیں تلاطمِ دریا میں پا چکا تھا کبھی

وہ آرزوئیں جنہیں خون دے کے پالا تھا
اُنہیں سے پوچھ تجھے کتنا چاہتا تھا کبھی

وہ کیا تھا سحر تری مست مست آنکھوں میں
کبھی تجھے تو دو عالم کو دیکھتا تھا کبھی

یہ انتہا ہے کہ تجھ کو بھی اب نہیں جائز
وہ ایک سجدہ خدا کو بھی جو روا تھا کبھی

اُڑا دیا ہے ترے غم کی دھوپ نے جس کو
وہ رنگ بھی مرے چہرے پہ کھیلتا تھا کبھی

وہی چراغ نگاہوں میں مسکراتا ہے
جو تیری بزمِ تصور میں جل رہا تھا کبھی

وہ باتیں میری زباں سے ادا نہیں ہوتیں
کرید کر جنہیں اوروں سے پوچھتا تھا کبھی

کچھ اس طرح کی بلا خیز ہے یہ طغیانی
کہ ناخدا بھی نہیں جو مرا خدا تھا کبھی
یہ زندگی ہے نفس دو نفس کا روگ نہیں
مری حیات ظفرؔ میرے بس کا روگ نہیں

بین السطور

اتنی سڑکوں پہ ہزاروں انساں   روز و شب شام و سحر چلتے ہیں
سانس لیتی ہوئی لمبی سڑکیں
دھوپ میں لیٹی ہوئی جلتی ہوئی
موڑ پر مڑتی ہوئی چلتی ہوئی
دوڑتی رہتی ہیں تنہا چپ چاپ
شام کی شعلہ فشاں رقاصہ
اِن پہ پھیلاتی ہے دامن اپنا

بپھر کے جاتی ہے راوی کی طرف
پھاند کر پُل کو چلی جاتی ہے
ایک سنسان سی ویرانی میں
اور کھو جاتی ہے پیڑوں میں کہیں
کئی انسانوں کا بیکار ہجوم
اپنے قدموں سے مسلتا ہے اسے
اِنھیں انسانوں میں وہ جنس بھی ہے
جو کبھی ماں ہے کبھی بیوی ہے
جس کی بے چارگیِ زیست کا راز
اُس کے معصوم خد و خال میں ہے
مسکرا دیتی ہے ہر ٹھوکر پہ
ہر شکست اُس کی مسرّت بکنار
اُس کی انگڑائی میں ہے وہ مستی
جو کسی بادۂ رنگیں میں نہیں

اُس کی خود بینی جہاں بینی ہے
اور عالم نگری، خود بینی ——
اُس کی تسکین کا ساماں کیا ہے؟
اُس کے ارمانوں کے گہوارے ہیں
دلِ ناکام پڑا جھولتا ہے
اُس کے ملبوس کی آرائش ہیں
جتنے اسبابِ دل آرائی ہیں
دعوتِ قلب و نظر ہوں، کہ نہ ہوں
ایک بات اُس کی عیاں ہے مجھ پہ
جس قدر داغ ہیں اُس کے دل کے
اُس کے دامن پہ چمک اُٹھتے ہیں ——
دونوں یک رنگ و ہم آہنگ ہیں دیکھو!
یہ سڑک اور یہ غمگیں عورت
موڑ پر مُڑتی ہوئی، چلتی ہوئی
اپنے سینے پہ اُٹھائے اِنساں ——

نردا

وسعتیں دیکھ کہ ہر سمت زمیں کی چادر
پھیلی پھیلی ہوئی افلاک سے جا ملتی ہے
ایک دن اس پہ ابھر آئیں گی وہ دیواریں
جن کے سایوں میں تمدّن کی کلی کھلتی ہے

وسعتیں دیکھ! بیاباں ہے سبک سر خاموش
ایک مرطوب ہوا! ایک سکوں بیز ہوا
ایک دن اس میں دھواں تیر کے لہرائیگا
اور افلاک پہ چھا جائے گی خوں ریز ہوا

وسعتیں دیکھو! ہر اک سمت جواں مست شجر
جیسے آزادِ دو عالم ہوں توانا جوگی
ایک دن اِن کو بھی کاٹیں گے غلامانِ غلام
اور انسان پہ انساں کی حکومت ہوگی

وسعتیں دیکھو! کبھی حسن تھا مسجود یہاں
اس جگہ چمکی تھی تلوار، بہے تھے دریا
اس جگہ جنّتِ آباد تھی گلشن گلشن
اور اب — ایک سکوں زار ہے صحرا صحرا

وسعتیں دیکھو! — مگر اٹھا ہے اک ابرِ سیہ
بوندیاں برسیں گی، بہہ جائیں گے دھارے ہر سو
پھوٹ نکلیں گی نئی کونپلیں، تازہ اشجار
حُسن چھٹکاتا ہوا آئے گا اپنے گیسو
نقش دھل جائیں گے اِس خاک کے چہرے سے ابھی
پردے اٹھ جائیں گے افلاک کے چہرے سے ابھی

انتقام

V. Good "Ashar"

آسماں گردشِ سیّارے سے تابندہ ہے
دیکھ! وہ میرے نصیبے کا ستارہ چمکا ـــــ
کیا اسی ایک ستارے کی ضیا قسمت ہے
جس کی پابند ہے ہر حال میں میری ہستی
اور میں جس سے رہائی بھی نہیں پا سکتا ؟
سوچ! کیا اس میری تعمیر کی گلکاری ہیں
اُنہیں احکام کی تعمیل ہے میرا حصّہ
جو مجھے میرے مقدّر کے ستارے سے ملے ؟

کیا یہی زرد سی معصوم سی کرنیں مجھ کو
اپنا پابند و گرفتار بنا سکتی ہیں؟
کیا یہی ایک حقیقت ہے کہ میرا ماحول،
میری میراث، مرا تجربہ، میری تخئیل
اِن کی ترکیب سے تقدیر نہیں بن سکتی؟
اس پہ حیراں ہوں کہ یہ نرم سی ہلکی سی آنچ
جو اسی ایک ستارے سے مجھے ملتی ہے
عمر بھر مجھ کو لٹا سکتی ہے انگاروں پر!

دل کے بہکانے سے مایوس امیدوں کے پرند
پھڑپھڑاتے ہوئے سینے سے نکل جاتے ہیں
کیا اِسے گردشِ تقدیر سے تعبیر کروں؟

مان لوں؟ — خیر یہی بات حقیقت ہے تو پھر
موت اِک اور حقیقت کا پتہ دیتی ہے

آدمی اپنے عناصر کو پریشاں کر کے
اِسی سیّارۂ خاکی میں مِلا دیتا ہے
اور بن جاتا ہے سیّارۂ زمیں، یہ دُنیا
یہی دُنیا جسے سیّارہ کہا جاتا ہے
خود بھی اک دوسرے سیّارے کی قسمت ہی تو ہے!
اور سیّاروں کی قسمت ہے بشر کے بس میں
یہی بے کار و سر افگندہ و مایوس بشر

وحشت

ایک خوشبو مرے ماضی کا سہارا لے کر
وقت کی سیڑھیاں چڑھتی ہی چلی آتی ہے ——
منزلیں عمر کی طے ہوتی چلی جاتی ہیں
دل کی دھڑکن ہے کسی ایسی گھڑی کی آواز
اپنی رفتار سے جو مجھ کو جگا دیتی ہے
مجھ کو بیگانۂ ادراک بنا دیتی ہے
ہاتھ پھیلاتا ہوں، دیوانہ بنا جاتا ہوں
الجھنیں اتنی بڑھا رکھی ہیں میں نے پھر بھی
ایک خوشبو مرے ماضی کا سہارا لے کر
وقت کی سیڑھیاں چڑھتی ہی چلی آتی ہے

(۲)

سانس کی لہر میں اک لرزشِ خوابیدہ ہے
چونک اُٹھتی ہے تو دیوانہ بنا دیتی ہے
اپنے ماحول سے بیگانہ بنا دیتی ہے
مجھ کو ہر شے میں نظر آتی ہے خوشبو — کس کی؟
میرے کانوں کی چھلکتی ہوئی آوازوں کو
اِسی خوشبو کی لپٹ گونج بنا دیتی ہے
گونجتی جاتی ہیں خوشبو کی گلابی لہریں
اور پھر کانوں میں آویزہ سا بن جاتی ہیں
پھیلتی ہیں تو کوئی نرم، ملائم آنچل
میرے ہاتھوں، مرے چہرے سے لپٹ جاتا ہے —
میری آنکھوں سے چھلکتی ہوئی رس کی بوندیں
اُسی خوشبو کی ہمہ گیر خبر لاتی ہیں —
آسماں دُور نہیں — مجھ کو مہک آتی ہے

میرے چہرے پہ ہیں یہ قوسِ قزح کے دھارے
لیکن اِن میں بھی ہے اک گیت اُسی خوشبو کا
آنکھ سُنتی ہے زباں تکتی ہے لب سونگھتے ہیں

اور ہر بات میں محسوس یہی ہوتا ہے
کوئی تارا ہو، کوئی چاند ہو، کوئی دُنیا
ہر جگہ ایک ہی خوشبو ہے، نہ جانے کس کی
تیری خوشبو تو نہیں! — تیری ہی خوشبو تو نہیں —!

آوازیں

گھوم کر آتی ہیں آوازیں قریب و دُور سے
راہ میں مُنہ زور سنّاٹوں سے ٹکراتی ہوئی
خامشی کی پُرسکوں لہروں میں پڑتے ہیں بھنور
گھورنے لگتی ہے سنّاتی ہوئی ٹھنڈی ہوا
کانپ سا جاتا ہے پھیکی تیرگی کا سرد دل
تیرتے لگتی ہیں ذرّوں کی حسیں پرچھائیاں
اور ——————— اور

اِس طرح آتی ہے آوازوں کے کھو جانے کی گونج
جس طرح دل ڈوب جاتا ہے کسی حسّاس کا ـــــ

(۲)

اور پھر اکثر صدائیں دُور کی آتی ہیں پاس
جھلملاتے نُور کے سایوں سے کتراتی ہوئی،
سنسناتی، نرم آوازیں، مہین و شرمگیں
کھیلتی، رُکتی، تھرکتی، ناچتی، گاتی ہوئی
حیطۂ احساس میں رکھتی ہیں جب اپنے قدم
چونک اُٹھتے ہیں کئی بے رنگ خوابوں کے خیال
اور ـــــــــــــــ اور
رفتہ رفتہ اس طرح ہوتی ہیں خاموشی میں گم
جیسے کھو جائیں کسی اندھے پجاری کے حواس

اصرار

چاند کی شب نواز کرنوں میں   ایک غنچہ حجاب پاتا ہے
نخ زدہ، برف خوردہ پتّوں کے   سرد سانسوں سے کپکپاتا ہے
خار بڑھتے ہیں خود جراحت کو   گر ندامت سے سر جھکاتا ہے
رات بھر دیکھتا ہے تاروں کو   رات بھر پیچ و تاب کھاتا ہے

کس قدر ہے ستم ظریف مگر
صبح ہوتے ہی مسکراتا ہے

(۲)

میں بھی اک غنچہ ہوں گلستاں میں — اور خزاں کے ستم اٹھاتا ہوں
چاند کی پیاس ریزہ کرنوں میں — اس کی مشعلیں جلاتا ہوں
اپنے ماحول کی جفاؤں سے — میں بھی رازِ حیات پاتا ہوں
زندگی کی شبِ سیہ لے کر — موت کی روشنی دکھاتا ہوں

لیکن اہلِ جہاں کی نظروں سے
غم چھپانے کو مسکراتا ہوں

رقص

چاندنی شب میں مری مرمر کی ناگن رقص کر
پھر اسی دُھن میں، اُسی گت پر چھناچھن رقص کر

چھن چھن، چھناچھن رقص کر — مرمر کی ناگن رقص کر
طبلہ کہے دُھن دُھن دھمک — چھاگل کہے چھُوچھاچھمک
آنکھوں کے تارے ناچ جائیں — گت کے سہارے ناچ جائیں
ہوں رقص میں یُوں اُنگلیاں — جیسے لچکتی کہکشاں
نیچی نگاہیں رقص میں — چاندی کی باہیں رقص میں
رُک اور رُک کر جھُوم جا — دیکھ اس طرف اور گھوم جا
گردن کو مٹکا کر دکھا — آنکھوں کو شرما کر دکھا
نازک کمر پہ ہاتھ رکھ — اب مان کہنا بات رکھ

چھن چھن چھنا چھن رقص کر
مر مر کی ناگن رقص کر

(۲)

بال بکھرا کر، ذرا باہیں اُٹھا کر رقص کر
یوں نہیں، ترچھی نظر سے مسکرا کر رقص کر

ہاں ہاں مٹک کر رقص کر — گیسو جھٹک کر رقص کر
سینے کو بل دے دے، ناچ جا — پاس آ کے چل دے، ناچ جا
آنچل اُٹھا کر مسکرا — آنکھیں جھکا کر مسکرا
آئی تنا تن کی صدا — پاؤں کو تیزی سے اُٹھا
حلقے بناتی گھوم جا — سر کو ہلاتی گھوم جا
آڑے کبھی، ترچھے کبھی — ایسے کبھی، ویسے کبھی
پہلو بدل کر یوں نکل — سانچے میں ڈھل کر یوں نکل
یاس و الم پہ وار کر — قلب و نظر بیدار کر

چھن چھن چھنا چھن رقص کر
مر مر کی ناگن رقص کر

۹۹۶۹

(۳)

پھر اسی سحر آفریں طرزِ ادا سے رقص کر
میں ہوں دیوانہ مگر تیری بلا سے، رقص کر

ہاں رقص کر دیوانہ وار   سیماب گوں پروانہ وار
بیتاب ہو کر گھوم جا   بدمست ہو کر جھوم جا
گردش میں آئے جامِ جم   رُک رُک کے چل چل چل کے تھم
پھر اک طرف کو جھک کے چل   ہو جھیل میں جیسے کنول
پھر لب ہلیں، انگلی اُٹھے   دل کی تمنا جی اُٹھے
خاموش لے میں گائے جا   شمعِ نظر اکسائے جا
چمکا کے اک دم بیٹھ جا   چھم چھم چھما چھم بیٹھ جا

چھن چھن چھنا چھن رقص کر
مرمر کی ناگن رقص کر

پھر بھیگیں کالی راتیں

یہ بھیگی برساتی راتیں
ہر بوند میں ایک ترنّم
یہ ہنستی، گاتی راتیں
ہر لے ہیں چھُم چھُم چھُم
بے تم ہوں کیسے باتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

(۲)

چھاتوں پر رِک ٹِک رِک ٹِک
کپڑوں پر رِس بِس رِس بِس
پتوں پر ٹِک ٹِک ٹِک ٹِک
اور ڈگر پہ بے کس بے کس
ہیں بے کس اور برساتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

(۳)

موٹر پر آؤں آؤں
تانگے پر ٹِک ٹِک نشاں نشاں
میں کیسے بات بتاؤں
سب اُلفت کے ہیں عنواں
سب اُلفت کی ہیں گھاتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

(۴)

کوٹھے پر نَم نَم نَم نَم
شیشوں پر ٹِن ٹِن ٹِن ٹِن
گرتے ہیں چَھم چَھم چَھم چَھم
ہے دل پر جھُن جھُن

اور جُھن جُھن ہیں برساتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

(۵)

کوچوں میں سَر سَر سَر سَر
چھجوں پر چَھل چَھل چُھو چُھو
نالوں میں کھَر کھَر کھَر کھَر
اور فرش پہ ہیں پَیں تُو تُو

یہ پَیں اور تُو کی باتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں

(۶)

ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ چھت پر
کیچڑ پر، تر تر دَل دَل
بوندوں میں، خوش ہو خوش کر،
ہیں بے کس اَور تو بے کل

ساون پر سو صلواتیں
پھر بھیگیں کالی راتیں—

عکس

ریشمیں ہے مرے امروز کا لمبا دامن
دوش کی وادیِ پُرخار پہ جو پھیلا ہے
آگے جب بڑھتا ہوں اُمید کے گلشن کی طرف
دوش کی وادیِ پُرخار کی اک جھاڑی سے
ریشمیں دامنِ امروز اُلجھ جاتا ہے
لوٹ کر دیکھتا ہوں دامنِ امروز کو میں
اور رُک جاتا ہوں — رُک جاتا ہوں اک آہ کے ساتھ

میرے ماضی کے بیاباں کی گھنیری وسعت
یوں سمٹ کر مری آنکھوں میں چلی آتی ہے
جیسے اک تیز نظر میں کسی خونخوار کا جوش
اور ماضی کے بیاباں کے رنگیلے کانٹے
جن کی آنکھوں میں لہو ہے مرے ارمانوں کا
میرے دامانِ تصور سے لپٹ جاتے ہیں
گونجنے لگتے ہیں کانوں میں پرانے قصے
سامنے آنکھوں کے آجاتی ہیں سُونی راتیں
سلسلہ چھیڑتا چلا جاتا ہے مایوسی کا
دوشِ مرحوم کے دامن پہ لہو کے چھینٹے
دُور سے روشن و تابندہ نظر آتے ہیں
بند کر لیتا ہوں آنکھیں غمِ محرومی سے

(۳)

اور پھر ــــ دیکھتا ہوں گلشنِ فردا کی طرف

پھول جھڑ جاتے ہیں امید کی ہر ڈالی سے
سونا سونا سا نظر آتا ہے سارا گلشن

یاس کے تار لرزتے ہیں لگاہوں میں مری
ڈوبنے لگتے ہیں آنکھوں کے فلک پر تارے
سر جھکا لیتا ہوں محروم تمنّا ہو کر

فردوسِ گوش

چمن میں چھیڑا کسی نے بہار کا نغمہ
گلوں کے رُخ پہ سنہری پھوار پڑنے لگی
ہوا میں اُڑنے لگے ٹمٹماتے پروانے —

شفق میں مجھ کو نظر آئی ایک کشتیٔ زر
سوار جس میں تھی وہ میری رازدارِ بہار
وہ میری جانِ گلستاں لئے ہوئے ہمرہ
خُمِ شراب، ستاروں کے زرد پیمانے —

مری اُمید، مری آرزو کے ساحل سے
اُفق کے پار روانہ ہوئی — روانہ ہوئی

(۲)

سُنا نگاہ نے میری بہار کا نغمہ
مرے لبوں پہ تھرکنے لگی خوشی کی کرن
مرے دماغ کی آبادیاں ہوئیں روشن
مری جبیں کو ستاروں کی سانس چھونے لگی،
وہی بہار کا نغمہ فضا میں گونج اُٹھا،
فضا میں؟ — ہاں مرے دل کی فضائے تیرہ میں —
وہ گونج پھیل کے اک بحرِ بے کنارہ بنی
ہر ایک موج کے پردے سے راگ لہرائے
ہوا میں خواب کی پرچھائیاں لپک اُٹھیں
جو اُس بحر سے اک جل پری نکل آئی
لپیٹتی ہوئی لہر دل کا دامن سادہ
ادا ادا میں سسکتی ہوئی نگاہ لئے
قدم قدم پہ جلاتی ہوئی چراغِ نجوم

مری اُمید، مری آرزو کے ساحل سے
اُفق کے پار روانہ ہوئی —— روانہ ہوئی

(۴)

نہ وہ چمن ہے نہ اب وہ بہار کا نغمہ
نہ گونج ہے مرے دل کی فضائے رنگیں میں
مرے لبوں پہ تھرکتی نہیں خوشی کی کرن
خنک ہیں میری نظر میں وہ زرد پیمانے
خُمِ شراب ہے اب چاند کی طرح خالی ——
نہ اب شفق ہے کہ ہو جس میں ایک کشتی زر
سوار جس میں ہو وہ میری رازدارِ بہار ——
نہ اب وہ نغمہ ہے باقی نہ راگ باقی ہے
بجھی ہوئی سی خیالوں میں آگ باقی ہے

موت

تیری باہیں مری گردن میں حمائل ہوکر
مجھ کو پرواز پہ اکساتی چلی جاتی ہیں
نرم، لچکیلی تری باہیں کہ جیسے کرنیں
کھیلتی کھیلتی سایوں میں کہیں رُک جائیں
عشقِ پیچاں کی کسی بیل کی صورت باہیں
میری گردن پہ کبھی ہلتی، کبھی کھلتی ہیں ——
میز پہ رکھی ہوئی ایک گھڑی دیکھتا ہوں

اُس کی دھڑکن بھی مرے دل کی طرح تیز ہے آج
اور باہیں بھی تری باہوں کی مانند اُس کی
کبھی ملتی ہیں کبھی مِل کے جُدا ہوتی ہیں
اِن کی گردش سے مرے شام و سحر بنتے ہیں،
یہی کُھلتی ہوئی ملتی ہوئی باہیں اُس کی
کبھی دن اور کبھی رات بنا دیتی ہیں
میرے شیرازۂ ہستی کے ورق یہ دن رات!
وقت انگڑائیاں لیتا ہے گھڑی کی باہیں
جوشِ مستی میں گھٹاؤں کی طرف اُٹھتی ہیں
اور گر جاتی ہیں محرومِ تمنّا ہوکر
زندگی اِن کے لئے گردشِ ہموار ہے — دیکھ!

(۲)

مجھ کو محسوس یہ ہوتا ہے، گھڑی کی باہیں
(تیری باہیں نہیں، فولاد کی بے حس باہیں)

میری گردن میں حمائل ہیں ازل کے دن سے
اور ہر روز کی اس گردشِ ہموار کے ساتھ
یہ گرفت اور کڑی ہوتی چلی جاتی ہے
نرم و نازک سی حسیں باہیں شکنجے کی طرح
میری گردن کو یونہی کستی چلی جائیں گی
اور اک روز مری سانس مرے سینے سے
ایک ناگن کی طرح ڈس کے نکل جائے گی
بے بسی میری نگاہوں سے لپٹ جائے گی ——
وقت کے دیو کی تصویرِ مجسّم، یہ گھڑی
مسکرائے گی مرے حال پہ، اس کی دھڑکن
تیز شعلوں کی طرح قہقہے برسائے گی ——
میرے شیرازۂ ہستی کے ورق — یہ دن رات
وقت کے ہونکتے جھونکوں سے پریشاں ہونگے

تو پریشاں نہ ہو — اِس طرح پریشاں تو نہ ہو
تیری باہیں مری گردن میں حمائل ہو کر
مجھ کو پرواز پہ اُکساتی ہیں — اُکسانے دے
آج کی رات مجھے وقت پہ چھا جانے دے —

ولولے

آسماں پہ چھا رہی ہیں بدلیاں
کاکلوں کی طرح لہراتی ہوئی
راگ میں ڈوبی ہوئی پرچھائیاں
آنچلوں کی طرح بل کھاتی ہوئی
چھا رہی ہیں جھومتی، گاتی ہوئی

(۱۴)

خوں کھولا جا رہا ہے کیا کروں

پیچ و خم کھاتا ہوا نیلا دھواں

روح پہ منڈلا رہا ہے کیا کروں

ولولوں کے ساز پر، دل میں نہاں

کوئی پیہم گا رہا ہے کیا کروں

گا رہا ہے گیت بے چنگ و نوا

جس طرح زلفوں کو پھیلائے کوئی

جس طرح چپکے سے آ جائے کوئی

جیسے آنکھوں کو نظر آئے کوئی

ایسے ہی آتی ہے کانوں میں صدا

جیسے لہراتی ہو لہروں پہ ہوا

اور یوں محسوس ہوتا ہے مجھے کوئی لہروں میں ڈبوتا ہے مجھے

ہر طرف ہے ایک محرابوں کا جال
دُور تک پھیلا ہُوا اک سلسلہ
جس طرح صحرا میں کوئی قافلہ
چھوڑ جاتا ہے نقوشِ پائمال
اس طرح محسوس ہوتا ہے مجھے کوئی لہروں میں ڈبوتا ہے مجھے
ہانپتی لہریں ہیں دل کے آس پاس
گھومتے گرداب میرے پاس پاس
دائرے پھیلے ہوئے ہیں دُور تک
جس طرح لَو دوڑتی ہے نُور تک
حَل ہوا جاتا ہوں میں گرداب میں
جل رہا ہے دل کے ایوانوں میں عُود
گیت ہیں یوں ذہن کے سیلاب میں
جس طرح گاتا ہو کوئی خواب میں
بے صدا، بے لفظ، بے ساز و سرُود

گزر جا دامن کسی خیال کا
[illegible]

(۳)

رفتہ رفتہ ولولوں کا کارواں
چھوڑتا جاتا ہے قدموں کے نشاں
راستے کے پیچ و خم کے ساتھ ساتھ
جھومتا جاتا ہے صحرا کا غبار
ہر قدم پہ، ہر قدم کے ساتھ ساتھ
جس طرح ناچے کوئی دیوانہ وار
نغمہ ہائے زیر و بم کے ساتھ ساتھ

مایوسی

ہزار بار جہاں سے گزر چکا ہوں میں
وہ رہگذر مجھے بھٹکا رہی ہے آج کی رات
گنوا رہا ہوں جسے جس آرزو کو چھیڑا تھا
وہ آنسوؤں میں نظر آ رہی ہے آج کی رات
نظر نظر میں چمکتے ہیں ٹوٹتے تارے
قدم قدم پہ مجھے ٹھوکریں پکارتی ہیں
وہ دھڑکنیں جنہیں دعویٰ تھا ناخدائی کا
دھڑکتے سینے میں اب ہاتھ پاؤں مارتی ہیں

مری نگاہ کی آئینہ دار ہے دنیا
وہ پیڑ ٹوٹ کے مجھ سے لپٹنا چاہتا ہے
یہ واقفِ غم و آلام ہے کوئی نغمہ
دبے دبے جو مرے پیچھے پیچھے آیا ہے

یہ کیا کہ ساز کی مانند گونجتا ہوں میں
وہ ہانپتا ہوا کھمبا بلا رہا ہے مجھے
یہ کانپتی ہوئی دیوار گر رہی ہے اِدھر
وہ اونگھتا ہوا چھجا ڈرا رہا ہے مجھے

سرکتا جاتا ہے قدموں تلے کا یہ رستہ
لپیٹتا ہے مرا جادۂ نظر کوئی
سمٹ رہی ہے وہ عالم کی بے حسی مجھ میں
خدا نہ کردہ اچکتا ہے مجھے اگر کوئی!!

زندگی

میز پر، کرسی پہ، چھت پر جالے
در و دیوار پہ اک گردِ سکوت
آئینہ ماند ہے اُس کی حیرت
دامنِ خاک میں پوشیدہ ہے ——
فرش پہ آئی ہوئی خاموشی
میرے قدموں کی صدا سے اُٹھی ——
کس قدر صاف ہیں قدموں کے نشاں
جو مرے پیچھے چلے آتے ہیں ——

اِس قدر گرد کہاں سے آئی؟
میز پہ میری کتابوں کو تو دیکھ
نام بھی اِن کے نہیں پڑھ سکتا
اِن سے چمٹے ہوئے بے حِس جالے...

اُف! دریچے کا وہ پردہ لرزا
اور اک گرد کا طوفان اُٹھا
مجھ کو آغوش میں لینے کے لئے ——

(۲)

سامنے دوسرے دروازے میں
دیکھ! ملتے ہیں جہاں دونوں کواڑ
ایک معصوم سی چھوٹی سی ہے درز
جیسے ملتے ہوئے ہونٹوں کے خطوط
انہیں ہونٹوں سے چھنی آتی ہے
ایک خاموش سی دوشیزہ لکیر

نور کی ایک ضیا بار سلاخ
ایک جلتی ہوئی قندیل کی لَو
جس سے کمرے کی فضائے سادہ
ایک بے رنگ سا افسانہ بنی
خاکِ پروانہ نہیں اس کو ہیں
ذرّے ہیں رقص کناں چرخ زناں —
ہر طرف بند ہیں خاموش کواڑ
اور پھر کمرے کی اس گرد کو دیکھ!

(۳)

تُو نہیں سمجھی —— یہی درز تو ہے
جس سے چھنتے ہوئے ذرّات کا نُور
فرش پر، میز پہ، دیواروں پر
ایک پردہ سا بچھا دیتا ہے
یہ زمیں اور نظامِ شمسی

انہیں ذرّات کا اِک پرتَو ہے
تو نہیں جانتی، یہ نرم سی خاک
یہی باریک و ملائم ذرّے
کٹ کے سورج سے یہاں پہنچے ہیں؟ —
کرۂ ارض کی ترکیبِ وجود
اِن کی خاموش اداکاری ہے
اِنہیں ذرّوں کا تصوّر ہے جہاں
اِنہیں ذرّوں سے بنی ہے دُنیا
یہی تقدیرِ دوعالم ذرّے
جانے طے کر کے مسافت کتنی
میرے اِس کمرے میں آپہنچے ہیں —

(۴)

گرد کا ڈھیر ہے ساری دُنیا
ہر طرف گرد کے دَل بادَل ہیں

میں یہاں سانس نہیں لے سکتا ـــــ

دیکھ وہ پردۂ در لہرایا
ذرے کے ذرّوں نے لی انگڑائی
اور اک گرد کا طوفان اُٹھا
مجھ کو آغوش میں لینے کیلئے ـــ

تھام لے مجھ کو مجھے روک کہ میں
انہیں ذرّوں میں ملا چاہتا ہوں

آنسو

ٹوٹ کر دِل کی اُمیدوں نے کیا ہے تعمیر
ایک بلّور کا شفاف محل آنکھوں میں
گھومتی جس سے نظر آتی ہے دنیا ساری
ڈوب کر جیسے اُبھرتی ہے بھنور میں کشتی —

ایک بے نُور دھندلکا ہے فضاؤں پہ محیط
جو مرے غم کی سیاہی کا پتہ دیتا ہے —

ابر آلودہ ہے منظر، کہ مری آنکھوں میں
صاف تصویر اُترتی ہی نہیں ہے کوئی
گھومتا جاتا ہے بلّور کا شفّاف محل
گھومتی جس سے نظر آتی ہے دُنیا ساری
ڈوب کر جیسے اُبھرتی ہے بھنور میں کشتی —

(۲)

یہی اُمیدیں تڑپتی تھیں کبھی سینے میں
وہ تڑپ دل میں مرے آگ لگا دیتی تھی
رات بھر کرتا تھا تعمیر ہواؤں میں محل
میری آنکھوں میں اُترتی تھیں ستارے بن کر
مسکراتی ہوئی، اٹھلاتی ہوئی تصویریں
جن کو میں اپنے محلّات میں لے جاتا تھا —
کس قدر صاف ہوا کرتی تھیں وہ تصویریں
لیکن اب دل کی اُمیدوں نے کیا ہے تعمیر

ایک بلّور کا شفّاف محل آنکھوں میں
جس میں تصویر نمایاں ہی نہیں ہے کوئی

(۳)

ایک بے نام حرارت ہے مرے پہلو میں
لڑکھڑاتے ہوئے سانس آتے ہیں سینے سے مرے
دل سے اٹھتا ہے دھواں اور تصوّر ان کو
ساتھ لے جاتا ہے اک آئنہ خانے میں مجھے
یہ نہیں آنکھوں میں بلّور کا شفّاف محل
یہ تو مرقد ہے نگاہوں کی پریشانی کا ——

پھر چلی لہر حرارت کی مرے سینے سے
پھر دھواں بن کے اٹھا اور مری آنکھوں میں
اور لو ٹوٹ گیا میری نظر کا مرقد ——
ڈوب کر جیسے ابھرتی ہے بھنور میں کشتی

اور چسکراتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے
یونہی ٹوٹی ہوئی امیدوں کا شفاف محل
دل کی بے نام حرارت سے ہوا ہے پانی
اور دھارے کی طرح پھوٹ کے بہہ نکلا ہے

افتادِ نگاہ

رگوں میں تیر رہا ہے فسونِ جاں کی طرح
تھرکتے ناچتے نغموں کی راحتوں کا سُرور
مگر مذاقِ جنوں آشنا کو کیا کہئے
کہ ہے خیال مرا میری ہر نگاہ سے دُور

سرود و ساز کے ہنگامے ختم ہو جائیں
مگر حیات کا ہنگامہ حرفِ آخر ہے
ہزار جلوے تڑپتے رہیں، مگر حاصل
خموشِ محفلِ ہستی کا ایک منظر ہے

مغنّیہ! تیرے نغموں کا ساز و برگ ہے کیا
تری تلاش فقط ایک دلکشی کی نمود
مگر وہ گیت جو آہوں میں ڈھل نہیں سکتا!
مگر وہ راگ جو ہے بے صدا و نم آلود!

یہ لوگ جن کی نگاہیں حجابِ مایوسی!
یہ راہیں قہقہے جن کے دھڑکتے رہتے ہیں!
یہ پیرہن ستمِ دردِ زیست کے غمّاز
یہ داستانیں — مکاں جن کو لوگ کہتے ہیں!

مغنّیہ تیرے نغموں کو کون سنتا ہے
کہاں مزار کے پھولوں کو کوئی چنتا ہے

سمرا ہے

راہ پر چلتے ہوئے دل میں خیال آتا ہے
ہر قدم مجھ کو لئے جاتا ہے منزل کے قریب
میں ابھی اپنے شبستاں میں پہنچ جاؤں گا
بھول جاؤں گا کہ یہ دن بھی کٹا مر مر کے
اور رفاقتوں کی ہلاکت میں بھی تلواریں
میری ہر رگ میں لہو بن کے مچلتی ہی رہیں —
بھول جاؤں گا کہ کمزور تھکی سانسوں نے
وقت کا ایک چراغ اور بجھا ڈالا ہے
زندگی سنگوں میں ڈھلتی رہی ڈھلتی ہی رہی

فلسفہ، شعر، محبت کے ہزاروں دفتر
پیٹ کی آگ میں جلتے رہے مجبور تھا میں
سینکڑوں سائے ابھرتے رہے نظروں میں مری
اور اب ایک ہی سایہ مرا ہمراہی ہے
ایک ہی سایہ مرے ذہن میں لرزاں ہے کہ میں
موت سے کتنا قریب ہوتا چلا جاتا ہوں
ہر قدم مجھ کو لئے جاتا ہے منزل کے قریب
میں ابھی اپنے شبستاں میں پہنچ جاؤں گا ——

ماضی، حال اور مستقبل

آ چکا ہوں خانماں برباد امیدوں سے تنگ
اے اُمنگ
لگ چکا ہے ضبطِ گویائی کی تلواروں کو زنگ

چاند نکلا ہے مگر تاروں سے کم ضو پاش ہے
یہ دلِ بے کیف ضبطِ نور کی پاداش ہے
اور ضبطِ نور سے لگتا ہے آئینے کو زنگ
اے اُمنگ
آ چکا ہوں خانماں برباد امیدوں سے تنگ

(۲)

مصلحت کرتی ہے میرے دل کے ہنگامے خموش

اے خروش!

گھومنے لگتے ہیں میرے سامنے فردا و دوش

چونکہ کمسنی کبھی آپس میں پھر ملتے نہیں

پر وہ شیشے ہیں جو گر جلتے تو ہیں کھلتے نہیں

دیکھتا ہوں اور آتا ہے تمناؤں کو ہوش

اے خروش!

مصلحت کرتی ہے میرے دل کے ہنگامے خموش

(۳)

ضبطِ گویائی کا اک دن ٹوٹ جائیگا رباب

اے شباب!

کھول کر سینے سے پھوٹے گا جنوں کا اضطراب

چاند ہم آواز ہو جائے گا میرے ساز سے
نُور جاگے گا مری ڈوبی ہوئی آواز سے

اور میں ہوں گا جہاں میں کامران و کامیاب
اے شباب!
ضبطِ گویائی کا اک دن ٹوٹ جائیگا رباب!

دہریہ

آج لے آیا کہاں مجھ کو سہارا دینے
شام کے تیز دھند لکے ہیں گھٹا کا طوفاں؛
میں کہاں اور کہاں یہ بُتِ بے کار و خموش
جس کے اعزاز میں سو بار جہاں والوں نے
مجھ کو سودائی کہا، مجھ کو جنونی سمجھا'

میرے اُلجھے ہوئے بالوں کا فسانہ سُن کر
کون ہے جو نہ ہنسا ہوگا میری حالت پر
اور یہ بُت جو کھڑا ہے مرا ہمسر بن کر
لوگ کیوں دیکھتے ہیں اسکی طرف عزّت سے
اِس کے احساس کی توقیر ہے اُنکے دل میں
اِس کے خاموش تکلّم سے سکوں پاتے ہیں
اِس کے افسانوں کو ہر شام کی خاموشی میں
ہیبت آمیز تقدّس سے سُنے جاتے ہیں
لیکن افسوس سمجھتے ہیں جنونی مجھ کو
لوگ کہتے ہیں کہ دیوانہ ہوں (دیوانہ ہوں میں؟)
ناتراشیدہ کسی سنگ، جو اس بُت کی طرح
میرے احساس کے شعلوں سے خبردار نہیں
مجھ پہ برساتے ہیں اُس کالی گھٹا کی صورت
عکس جس کا ہے یہ ترشے ہوئے پتّھر کا خدا ـــ

(۴)

اے مرے مدِّ مقابل یہ مرا عزم ہے آج
آج کی شام کے سنّاٹے میں اس بارش میں
اپنے احساس کے شعلوں کو کروں یوں ٹھنڈا
کہ مرا جسم بھی اک سنگِ سیہ بن جائے
منجمد ہو مری ہر رگ میں مرا گرم لہو
خاک کا پُتلا ترا شا ہوا پتّھر بن جائے
ٹھوس ہو جائیں مرے لب کہ بیاں کر نہ سکیں
وہ حکایت جسے مجذوب کی بَڑ کہتے ہیں —

کل بھی لوگ جب آئیں گے یہاں پوجا کو
دیکھ کر مجھ کو ترے پہلو میں بڑا کا رو خموش
تیری صورت مجھے دیکھیں گے بڑی عزت سے
میرے خاموش تکلّم سے سکوں پائیں گے

ہاں ایسے لوگ جو سودائی سمجھتے ہیں مجھے
اپنے سجدوں سے مرے قلب کو گرمائیں گے
اور میں تیری طرف دیکھوں گا خاموشی سے
اے تراشے ہوئے پتھر کے سیہ فام رقیب!

سامانِ تسکین

دل کی دھڑکن سے عبارت ہیں امیدیں اور سے ست
ہر ستارے کو تمنّائے ابتا ہوتی ہے
آرزوبن کے سمندر کی اُبھرتے ہیں حباب
شب کے پہلو سے سحر جلوہ نما ہوتی ہے
کارواں چلتے ہیں منزل کا سہارا لے کر
اور منزل کی کشش راہنما ہوتی ہے

قطرے قطرے میں ہے طوفانِ تمنّا بے تاب
موج قلزم کے لئے آبلہ پا ہوتی ہے
ذرّے ذرّے سے چھلکتی ہے بیاباں کی طلب
پھول کے لب پہ گلستاں کی دعا ہوتی ہے
مضطرب ہے مرے دل میں بھی تو ارماں کوئی
جی رہا ہوں تو بھلا تم پہ ہے احساں کوئی
کچھ نہ کچھ باعثِ تسکیں بھی ہے مایوسی میں
ہر ستارے کی کرن نور میں ڈھل جاتی ہے
ذرّہ ہم پہلوئے ذرّہ نظر آجاتا ہے
خار کی پھانس رگِ گل سے نکل جاتی ہے
متصل چلتے ہیں دریا پہ حبابوں کے حباب
قسمتِ شب مہ و انجم سے بدل جاتی ہے
کارواں منزلِ مقصود کو جا لیتے ہیں
شبنم آغوشِ گلستاں میں مچل جاتی ہے

آرزو ہے تو مقابل نہیں طوفاں کوئی
تیز ہو لہر تو دیوار بھی گل جاتی ہے

تم میں اور میرے خیالوں میں بہت دوری ہے
میری تسکین بھی آلودۂ مجبوری ہے

تعمیرِ نو

میں نے پایا تمہیں انسانوں کے اُس جنگل میں
جس میں خود کھویا ہوا پھرتا رہا ہوں برسوں
ٹھوکریں کھاتا، اُلجھتا ہوا، گرتا پڑتا
میرے قدموں کے نشاں خون سے آلودہ ہیں
قہقہے مجھ پہ لگاتے رہے بے برگ ببول
یہی انسان ——— یہ تنتے ہوئے پُرہول شجر
خیر! وہ بات گئی۔ بھول بھی سکتا ہوں اُسے
مجھے انسانوں میں رہنا ہے۔ ابھی جینا ہے
ان کے بُو دار سڑے سانسوں میں دم لینا ہے ———

آج میں ان کی نگاہوں میں نہیں وہ غنچہ
جس کو ہر سایۂ کفِ پا سے مسل سکتا ہے
اب تو اعضا میں نہیں میرے وہ نرمی جس سے
میں ہر اک چوٹ پہ دل تھام کے رو دیتا تھا
اب تو انسانوں کے اس جھنڈ میں بے باکانہ
بے خطر تم کو لیے دھوم مچا سکتا ہوں
مسکرا سکتا ہوں، جی سکتا ہوں، گا سکتا ہوں
گیت بڑھتی ہوئی موجوں کے سنا سکتا ہوں
اب تو انسانوں کے اس جھنڈ میں بے باکانہ
آگ میں اپنے ترانوں سے لگا سکتا ہوں
اب کفِ پا سے مسل سکتا ہوں اس کے سائے
اب تو جو بھی کہو میں کر کے دکھا سکتا ہوں
انہی انسانوں کے پر ہول گھنے جنگل میں
موت نے آنکھیں ملائی تھیں مری آنکھوں سے

اور میں ــــ خیر اُسے چھوڑو، اُسے جانے دو
مسکرا سکتا ہوں ـــــ اب آئے تو موت آئے تو موت

اب تو وہ بات نہیں، اب وہ غم و یاس نہیں
اسکا تو میرے تصور کو بھی احساس نہیں

لیکن اک بات ـــ فقط تم کو بتا سکتا ہوں
اور وہ یہ ہے کہ انسانوں کے جس جنگل میں
مسکراتا ہوا، گاتا ہوا، شاداں، فرحاں
میں ابھی تک ہوں، لگ جانے تمہیں بھی پاکر
ایسی انسانوں کے پرہول گھنے جنگل میں
میرے احساس میں کیوں آگ سی لگ جاتی ہے
جیسے چونک اُٹھتی ہو تم رات کی خاموشی میں
کسی آہٹ سے، کسی اور کی سرگوشی سے
میرے احساس میں بھی یوں ہی سُلگ اُٹھتی ہے
وہی چنگاری مری راکھ میں جو باقی ہے

(۳)

یہی چنگاری سلگ اُٹھے گی سینے سے مرے
اور انسانوں کے پُرہول گھنے جنگل میں
آگ لگ جائے گی اُس آگ کے شعلوں کا دھواں
آسماں بن کے مرادیں مری بر لائے گا
قہقہے میرے گھٹاؤں سے چھلک اٹھیں گے

(پھر سے آدم کی ضرورت تو نہیں دنیا کو؟)

غزل

(لغوی اعتبار سے)

کہو اک بات کہوں کوئی سُنے گا تو نہیں
تم سُنو گی! ارے ہاں تم تو سُنو گی، لیکن
سوچ لو سُن کے بُرا تو نہیں مانو گی اُسے
تم بُرا مانو گی — میں جانتا ہوں، جانتا ہوں
خیر! لو آؤ، سُنو، آؤ — قریب آ جاؤ
کوئی آ جائیگا؟ — آئے گا تو پھر کیا ہو گا!
پھر سہی، پھر سہی، جاؤ کوئی آ جائے گا
اب کہوں؟ — سوچ لو، میں تم سے کہے دیتا ہوں

نہیں مانو گی؟ — نہیں مانو گی تم؟ — مان بھی جاؤ
کیوں مجھے اپنی قسم دیتی ہو، ٹھہرو، ٹھہرو —
چھیڑتا ہوں؟ — تمہیں میں چھیڑتا ہوں! خوب، چہ خوب
اچھا! — تو آؤ سنو — تم تو نہیں مانو گی
مانو گی؟ — اچھا — کہے دیتا ہوں میں نے کل رات
دل میں سوچا تھا کہ اب تم سے نہیں بولوں گا —

کیفیتیں

کانوں نے اک بات سُنی تھی   سُنی تھی میری آنکھوں نے بھی
کانوں سے وہ ٹھنڈا نغمہ   میری رگوں میں بھی جا پہنچا
لذّت اُس کی مے کی سی تھی   کانوں سے دل میں اُتری تھی
اُس کی مستی تازہ بتازہ
اُس کا نشّہ بے اندازہ

آنکھوں نے جو بات سنی تھی ان آنکھوں کی تھی، اپنی تھی
کہنے میں وہ لب جو ہلے تھے آنکھوں کے غنچے بھی کھلے تھے
اُن پھولوں کی جنبش کیا تھی دل میں ہلچل سی برپا تھی
گو اُس کی آواز نہیں تھی
میگوں تھی، شیریں تھی، حسیں تھی
دونوں نے مل کر کیا سمجھایا جانے جس کی سمجھ میں آیا
میں تو اتنا دیکھ رہا ہوں
پہلے کیا تھا اور اب کیا ہوں

ابدیت

کنارِ آبِ رواں آج بھی وہی ہے سکوں
جب نکالا تھا شہروں کے شور پہ ہم نے
ہجوم بکھرا ہوا شام کی صداؤں کا
گھروں سے ٹھوکریں کھاتا ہوا گزرتا ہے
ہوا کے آہنی پنجوں کی برف خوردہ گرفت
اُسے پکڑ کے فضا میں دھکیل دیتی ہے —
ہنسی کے شعلے لپکتے ہیں سرد سانسوں سے
مگر چراغِ مسرت جلا نہیں سکتے
یہ خود بھی سرد ہیں مایوس مضطرب سی ہنسی
فسردگی کے دھوئیں میں سمائی جاتی ہے

نگاہیں ملتی ہیں، بے اختیار ملتی ہیں
مگر دلوں میں اترتی ہیں آرزو کی طرح
ربابِ عشق صدا دے کے ٹوٹ جاتا ہے

گلال چہروں پہ رنگِ شفق ہے جیسے
کسی نے آگ لگا دی ہو ابر پاروں میں —

اداس مرثیہ خواں، دل فگار تعمیریں
بجھے ہوئے سے چراغوں کو لے کے بیٹھی ہیں
سیاہ چادرِ شب میں چھپی ہوئی آنکھیں
تراشتی ہیں ستاروں کے ان گنت آنسو

مہیب چیخ جگاتی ہے کارخانوں کو
تو ان کی لمبی بڑی ناک سے دھواں اٹھ کر
دبوچ لیتا ہے ہاتھوں میں آفتابوں کو

تقاضا ہائے شرافت سے مسکراتے ہوئے
وہ لوگ جن کے پلندوں سے گرد اڑتی ہے

مشین بن کے گھسے جاتے ہیں وفا تر ہیں
یہ مسکراتی ہوئی روتی صورتیں اِن کی
نہ دیکھی جائیں گی مجھ سے نہ دیکھی جائیں گی
مجھے یہاں سے کہیں دور لے چلو کہ یہاں
حرارتِ ابدی بیچ کر خریدتے ہیں
وہ ایک نانِ جویں جس سے موت ملتی ہے

(۲)

سُنا ہے آج بھی آپ زوال کے دھارے پر
وہی سناؤں ہے نکالا تھا جس کو شہر نے
حقیر جان کے لیے آبرو سمجھتے ہوئے
نہیں چلیں کہ تمہاری نگاہ کی مستی
فضائے دل پہ مسرت کی چاندنی بن کر
تمہارے ساتھ مجھے لازوال کر دے گی

بتکدہ

مری نگاہ میں شامل ہے فطرتِ آدم
مگر یہ دیکھا ہے میں نے کہ ہر در پہ جھکے ہیں
کہیں خدا کا، کہیں ناخدا کا ہے پرچم
ملے ہیں ورثے میں سجدے کہیں بتوں کیلئے
کہیں ستاروں میں روشن ہیں قسمتوں کے چراغ
کہیں مزاروں پہ تسکینِ قلب بکتی ہے
کہیں عقیدوں کے شعلوں سے جل بجھے ہیں دماغ
نہ سوچ ہے نہ تفکر سے کام لیتے ہیں
یہاں بتوں سے خدا کا پیام لیتے ہیں

(۲)

نگاہِ فکرِ بشر آج بھی ہے زنگ آلود
اُفق کے پار رسائی نہیں خیالوں کی
صدا پہنچتی ہے لیکن فلک پہ نالوں کی
سپر کا کام دیا آہِ نارسیدہ نے
بہا دیا ہے حوادث کو آبِ دیدہ نے
یہ کچھ عجیب تخیّل ہے ذہنِ انساں کا
خود آفریدہ مصیبت پہ خود فریب سجُود
اور اُس پہ نیم شبانہ صدائے یا معبُود!

(۳)

مگر یہ تیرے لبوں پہ تبسّمِ حیرت
یہ تیرے دیدۂ مخمور کا بیانِ خموش
یہ تیری کانپتی نظروں کی داستانِ خموش

نہیں نہیں مری بے رہبری پہ نفرت کیوں
مری نگاہ میں شامل ہے فطرتِ آدم
میں تیری ذات کو سجدہ روا سمجھتا ہوں

بھوک

بھوک زندہ رہے تاحشر تو بھی زندہ رہے
کوئی آسودۂ آلام نہ ہونے پائے
کوئی آرام سے بے فکر نہ سونے پائے
اس کی عظمت رخِ ایام پہ تابندہ رہے

بھوک زندہ ہی رہے جس کی حرارت کے سبب
آنکھیں کھل جاتی ہیں، ماحول بدل جاتا ہے
دل سے تعظیم کا احساس نکل جاتا ہے
پیدا ہو جاتے ہیں سب فکرِ معیشت کے سبب

بھیڑیئے بھیس سے ہوتے پھرتے ہیں انسانوں میں
جن کی پہچان اسی بھوک سے ہو جاتی ہے
آرزو خار شرافت کے چبھو جاتی ہے
اور پیوند نظر آتے ہیں دامانوں میں

بھوک مٹ جائے تو یہ تیری محبت کی نظر
دو ہی دن میں خطِ بیکار نظر آنے لگے
ہم میں حائل کوئی دیوار نظر آنے لگے
میرے چہرے پہ بکھر جائے شکایت کی نظر

بھوک زندہ ہے تو احساس بھی تابندہ ہے
آرزو میری، تری چشمِ طلب بھوک ہے دیکھ!
بھوک ہے سینۂ سوزاں میں جو اک ہوک ہے دیکھ!
بھوک سے میں ہی نہیں، تو بھی تو پائندہ ہے

معیارِ آدمیت

جیسے چینی کے خام برتن کو
خوب اچھی طرح پرکھتے ہیں
ویسی ہی آدمی کی حالت ہے
توپ کی آنکھ جانچتی ہے اُسے
رائفل اس کا ناپ لیتی ہے
اور ہم اُس کو آزماتے ہیں —

نیا سال

زندگی سیکڑوں دیواروں کا، سایوں کا ہجوم
لاکھ پامال لکیروں کا، خیالوں کا طلسم
اور صدیوں کی گرانبار سیہ لاشوں سے
ایک اوہام کے ہاتھوں کا تراشا ہوا جسم

زیست کا جال، تعین کی حدیں دیکھتا ہوں
ذہن پر، کانوں پہ، آنکھوں پہ، زباں پر پہرے
ایک ہی راہ پہ خاموشی سے چلنے والے
اپنے اجداد کی اقدار کو کیسے پرکھیں

لاکھ صدیاں جیسے دُہراتی چلی آئی ہیں
ہم اُسی درس کو کس طرح فراموش کریں
جو صدا مسجد و مندر سے اُٹھی ہے اب تک
اُس کو انکار سے کس طرح سجا کر رکھ دیں

اب اسی رہ، اسی انداز سے چلنا ہوگا
اب بھی شام و سحر وقت کے گہوارے ہیں
اب اسی وقت کی زنجیر گراں کی کڑیاں
ہم کو جکڑیں گی — کہ ہم وقت کے ہرکارے ہیں

اب کیسی رخصت آوارگی و گمراہی
اب اسی راہ پہ چلنا ہے ہمیں گام بہ گام
اب ہر اک سانس پہ لمحات کی پابندی ہے
اب یہاں لمحوں میں بٹتی ہے شرابِ ایّام
جانے یہ سلسلۂ سن و مہ و سال ہے کیا
جانے کب تک یہ ہے انسان توہّم کا اسیر

میں سمجھتا ہوں کہ ہے ایک اضافی سا خیال
یہ شب و روز کا خول اور یہ لمحوں کا خمیر
لمحے گھُل مِل کے گیا سال بنے سال گیا
لمحے گھُل مِل کے نیا سال بنے سال آیا

انجام

میں اپنی زندگی کی لاش سے لپٹ کے گا چکا
میں اپنی خواہشوں کی موت پر خوشی منا چکا
میں اپنے آنسوؤں کی چلمنوں سے مسکرا چکا

یہ کیسی صدائے سازِ غم
الم، الم، الم، الم
اسی صدا کے ساتھ ساتھ

میں چلا قدم قدم
اسی صدا سے میں چراغِ آرزو جلا چکا
میں اپنی زندگی کی لاش سے لپٹ کے گا چکا

(۲)

طلسمِ خانۂ خیال میں حیات کٹ گئی
سہارے لیتے لیتے عمر بے ثبات کٹ گئی
ستارے گنتے گنتے میری ساری رات کٹ گئی

سکوں کی آرزو رہی
تلاشِ رنگ و بو رہی
دلِ جنوں نصیب کو
امیدِ گفتگو رہی

زباں تک آ کے بھی نہ پائی تھی کہ بات کٹ گئی
طلسمِ خانۂ خیال میں حیات کٹ گئی